پیامِ قرآن کی پیشکش

منکرینِ معجزہ کے مؤقف کا جائزہ

پیام قرآن کی پیشکش

منکرینِ معجزہ کے مؤقف کا جائزہ

www.facebook.com/payamequran

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ

﴿الأنبياء: ٦٩﴾

ہم نے کہا "اے آگ، ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر"

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿یونس:۳۹﴾

بلکہ انہوں نے اس چیز کا انکار کیا جو ان کے علم کے دائرہ میں نہ سما سکی اور جس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی نمودار نہیں ہوئی۔ ایسے ہی ان لوگوں نے انکار کیا جو ان سے پہلے تھے تو دیکھو کہ ظالموں کا کیا انجام ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریباً سب قارئین حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ سے واقف ہوں گے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے بت خانے میں گھس کر تمام بتوں کو ماسوائے بڑے بت کے توڑ دیا تھا اور جب ان کو اس جرم میں "جیوری" کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے جو دلائل پیش کیے ان کے سامنے ان کی قوم اور ان کے مذہبی پیشوا لاجواب ہو گئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جھونک دیا جائے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ کے ہمراہ وہاں سے ہجرت کر گئے۔
قرآن میں سورۃ الانبیاء اور سورۃ الصٰفٰت کی مندرجہ ذیل آیات میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾

کہنے لگے کہ اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو (٦٨) ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہوجا اور ابراہیم پر سلامتی والی بن جا (٦٩) اور ان لوگوں نے برا تو ان کا چاہا تھا مگر ہم نے ان ہی

کو نقصان میں ڈال دیا (۷۰) اور ابراہیم اور لوط کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا جس میں ہم نے اہل عالم کے لئے برکت رکھی تھی (۷۱) (الانبیاء)

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿۹۷﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۹۹﴾

وہ کہنے لگے کہ اس کے لئے ایک عمارت بناؤ پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو (۹۷) غرض انہوں نے ان کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے ان ہی کو زیر کردیا (۹۸) اور ابراہیم بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے رستہ دکھائے گا (۹۹) (الصافات)

اسرائیلی روایات میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔(بحوالہ تفسیر ماجدی انگلش)

147. (anything at all to help your gods). Death by fire was a usual punishment in many ancient nations. *Cf*. the Talmud: — "During this time Nimrod convened his council .... And the counsellors replied: "He who acts disrespectfully to the king should meet death upon the gallows; this man has done more; he is guilty of sacrilege, he has insulted our gods; therefore he should be burned to death. If it be pleasing to the king, let a furnace be heated, day and night, and then let this Abram be cast therein." This advice pleased the king, and he commanded such measures to be taken forthwith.' (Polano, op. cit., pp. 37, 38).

148. (as he was cast into the fire). According to the Jews: "Nimrod ordered Abraham to be cast into a furnace. He had a pile of wood five yards in circumference set on fire, and Abraham was cast into it"- (Jewish Encyclopedia. I. p. 86)

149. (whereupon the heat of the fire miraculously ceased, and the pile turned into a sort of pleasant meadow). "God Himself went down from heaven to rescue him"- (Jewish Enclopedia. I. p. 86)

(Tafseer ul Quran by Abdul Majid Daryabadi vol. 3, p. 159. footnotes Surat-ul-Anbiya)

آتشِ نمرود اور سر سید احمد خان:

اس قصہ کے تمام نکات سے اہلِ اسلام ہمیشہ متفق رہے کہ یہ واقعہ اسی طرح ہی پیش آیا(بشمول فلاسفہ اور عقلیت پسند معتزلہ)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واقعی آگ میں جھونک دیا گیا تھا اور اللہ پاک کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ یعنی آگ بھڑکتی تو رہی مگر اس کی حرارت سلب ہو گئی تھی۔

مگر برصغیر کے اندر سر سید احمد خان نے اس بات کو خلافِ عقل قرار دے دیا کہ کوئی انسان آگ میں گر کر بھی اس طرح زندہ بچ سکتا ہے کہ آگ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ سر سید صاحب کے بقول قرآن میں اللہ کا قانون بیان ہوا ہے کہ آگ ہر حال میں جلائے گی، یہی قانونِ فطرت ہے۔ اس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اپنی تفسیر کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

ایک جگہ ابراہیم کے قصہ میں فرمایا ہے۔ فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اقتلوہ او حرقوہ فانجاہ اللہ من النار (آیت ۲۳ عنکبوت ۲۹) فانجاہ اللہ من النار سے ثابت ہوتا ہے کہ احراق خاصہ نار کا ہے +
ایک اور جگہ تمثیل میں فرمایا ہے۔ فاصابہا اعصار فیہ نار فاحترقت (آیت ۲۶۶ البقرہ ۲) پس ان دونوں آیتوں سے خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے۔ پس جب تک یہ قانون فطرت قایم ہے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے +

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ پاک نے قرآن میں یہ بتایا ہے کہ آگ جلاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ پاک کوئی سائنٹفک کلیہ بتارہے ہیں کہ آگ ہمیشہ اور ہر حال میں جلائے گی یہ تو صرف ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ یہ بات سرسید صاحب نے اپنے پاس سے فرض کرلی ہے کہ خدا نے ہم کو قانون بتایا۔ وہی خدا اصاف اور واضح الفاظ میں جب آگ کو حکم دیتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا تو سید صاحب اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

میرے خیال میں اگر اس طرح قرآن سے فطری قوانین برآمد کرنا کوئی دانائی کا فعل نہیں ہے کیونکہ ہم جن چیزوں کو فطری قوانین کہہ رہے ہوتے ہیں وہ صرف ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ مشاہدہ کچھ نئی ایجادات کے بعد تبدیل ہو جائے۔ مثلاً آج سے ۱۰۰ سال پہلے اگر برصغیر کا کوئی بندہ کسی کو کہتا کہ رات میں نے اپنے بھائی سے جو کہ انگلستان میں ہے بات کی ہے۔ تو اس کی یہ بات اس دور کے "قوانینِ فطرت" کے خلاف ہوتی۔ مگر آج جدید ذرائع مواصلات کی موجودگی میں یہ بات عین فطرت ہے۔

اب قرآن سے کچھ مثالیں دیتا ہوں کہ اگر ان کو قانونِ قدرت سمجھ لیا جائے تو کتنی پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَىٰ ظَهْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿الشوری: ۳۳﴾

اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھیرا دے اور جہاز اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ تمام صبر اور شکر کرنے والوں کے لئے ان (باتوں) میں قدرت خدا کے نمونے ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَن يَأْتِيكُم بِمَاءٍ مَّعِينٍ ﴿الملك: ۳۰﴾

اِن سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اِس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟

اب ان دو مثالوں کو لے کر کہہ دیا جائے کہ قانونِ قدرت ہے کہ بغیر ہوا کے بحری جہاز نہیں چل سکتا۔ اور پانی اگر زمین میں زیادہ گہرا چلا جائے تو اسے اوپر نہیں کھینچا جا سکتا۔ تو آج کا انسان آپ پر ہنسے گا۔ کیونکہ اب بحری جہاز ہوا کے محتاج

نہیں رہے۔ اور پانی جتنا گہرا ہو رہا ہے انسان اتنی ہی زیادہ طاقت کی مشینیں بنا رہا ہے کہ پانی کو اوپر کھینچ سکے۔ بلکہ اب تو سمندری پانی کو میٹھا بنانے کے پلانٹ بھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ تو کیا قانونِ قدرت غلط ہو گیا؟ اصل میں بات یہ ہے کہ اللہ پاک یہاں کوئی قانونِ قدرت نہیں بیان کر رہے بلکہ مشرکین کو ان کے مزعومہ "خداؤں" کی حقیقت بتا رہے ہیں کہ وہ اللہ پاک کے ساتھ کوئی شراکت داری نہیں رکھتے۔ وہ نہ ان کے لیے ہوا چلا سکتے ہیں نا زمین سے پانی کھینچ سکتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو مثالیں انہی چیزوں کی دی جا رہی ہیں جو ان کے ارد گرد موجود ہیں۔

یہ مسئلہ سر سید صاحب کے بھی سامنے تھا کہ علم تو ترقی پذیر رہتا ہے اور مستقبل میں نئے نئے انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں تو کیا اس طرح اپنے دور کے سائنسی "حقائق" کو قرآن سے "ثابت" کرنا مناسب ہے جن کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ مستقبل میں وہ اپنا وجود برقرار رکھ پائیں گے یا رد ہو جائیں گے۔ سر سید صاحب اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ایک بہت بڑا معجزہ یہ ہے کہ ہمارے ہر درجہ علم میں ان امور میں جن کی ہدایت کے لئے یہ قرآن نازل ہوا ہے یکساں ہدایت کرتا ہے اس کے الفاظ ایسے اعجاز سے نازل ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہمارے
>
> علوم کو ترقی ہوتی جاوے گی اور اس ترقی یافتہ علوم کے لحاظ سے ہم اس پر غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اس کے الفاظ اس لحاظ سے بھی مطابق حقیقت ہیں اور ہم کو ثابت ہو جاویگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیئے تھے اور اب غلط ثابت ہوئے وہ ہمارے علم کا قصور تھا نہ الفاظ قرآن کا۔ پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانہ میں ایسی ترقی ہو جاوے کہ اس وقت کے امور محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کرینگے اور اس کو ضرور مطابق حقیقت پاوینگے اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیئے تھے وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ اپنے علم کے حساب قرآن کی تفسیر کر کے اپنے اندھے مقلد پیچھے چھوڑ جائیں گے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ نئی تحقیقات سامنے آنے پر ان میں آپ کو غلط کہنے کی جرات ہو گی؟ اس سے اچھا نہیں ہے کہ قرآن کے جو

معنی ظاہر ہو رہے ہیں اور جو مفہوم بن رہا ہے اور جس کی تائید پچھلے صحیفے بھی کر رہے ہیں ان پر ہی قائم رہا جائے اور مروجہ سائنسی نظریات کو قرآن سے علیحدہ ہی رکھا جائے، تاکہ مذہب اور سائنس کی خوامخواہ کی جنگ نہ چھڑے۔

قدیم یونان میں زمین اور سورج کے بارے دو نظریات تھے ایک یہ کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور دوسرا یہ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ مگر ثانی الذکر موقف کو بڑے بڑے دماغوں کی تائید حاصل تھی اس لیے یہی نظریہ زیادہ مقبول ہوا۔ اور مسلمانوں میں سے بھی کچھ لوگوں نے قرآن میں سے برآمد کرلیا کہ زمین ساکت ہے۔ پھر جب یہ "انکشاف" ہوگیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو یار لوگوں نے اس نظریہ کو بھی قرآن سے برآمد کرنے کی سعی شروع کردی۔ اب سرسید صاحب یہ جاننے کے باوجود کہ جن لوگوں نے یونانی فلسفہ کو اٹل سمجھتے ہوئے قرآن کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تھی وہ غلط ثابت ہوئے ہیں، خود بھی یہی کام کر رہے ہیں کہ فی الحال موجودہ سائنسی "حقائق" تو قرآن سے ثابت کرو۔ البتہ اگر مستقبل میں آج والا نظریہ غلط ثابت ہوگیا تو نیا نظریہ بھی قرآن میں سے ہی "برآمد" کریں گے۔ سرسید صاحب اس بارے ارشاد فرماتے ہیں:

مثلاً فرض کرو کہ قرآن مجید سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ سورج زمین کے گرد پھرتا ہے جس سے طلوع و غروب ہوتا ہے اب معلوم ہوا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے گرد پھرتی ہے اب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج کا پھرنا قرآن مجید میں بطور حقیقت واقع کے بیان نہیں ہوا بلکہ علیٰ ما یشہد و الناس بیان ہوا ہے اور وہ سچ ہے۔ پس ہم نے جو اس کو بطور حقیقت واقع کے سمجھا تھا وہ ہماری غلطی تھی نہ قرآن مجید کی غرضکہ ترقی علوم سے ہم کو ان سے رجوع کرنا جو ہم نے پہلے نسبت قرآن کے قرار دیئے تھے اور قرآن مجید کا اس کے مطابق پانا جس کی طرف ہم نے بعد ترقی علم رجوع کی ہے ہمارے علم سابق کا نقصان اور قرآن مجید کے کامل ہونے کا ثبوت ہے مگر ہماری نسبت کسی قسم کی طعنہ زنی کا سبب نہیں +

جو لوگوں کے مشاہدے میں ہوتی ہے یعنی ہمیں تو سورج اور چاند زمین کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں اور یہی قرآن کا

مقصود ہے۔ اور قرآن کا مقصود کوئی سائنسی حقائق یا Laws of Nature سمجھانا ہوتا تو نبی پاک ﷺ مدینہ میں لیبارٹریاں اور رصد گاہیں قائم کرتے۔ دنیا داری نبھانے کے لیے سائنس کا علم، سائنسی تحقیق اور سائنسی ترقی بہت ضروری ہے مگر اسے مذہب سے الگ رکھنا بہت ضروری ہے۔ مذہب کا اپنا دائرہ ہے اور سائنس کا اپنا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الجھانے کے وہی نقصانات ہوتے ہیں جن میں آج ہم مسلمان مبتلا ہیں۔

جناب سر سید، اس بات پر کہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ معجزہ قانون فطرت میں مستثنیات کی علامت ہے جس طرح ہر قانون کی کچھ (Exemptions) ہوتی ہیں، فرماتے ہیں:

جو قانون قدرت کہ انسان نے تجربہ سے قایم کیا ہے اُس کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ جب تمام قانون فطرت ابھی تک نا معلوم ہیں تو ممکن ہے کہ کوئی قانون فطرت ایسا ہو جس سے مستثنیات ثابت ہوتے ہوں۔ مگر یہ کہنا کافی نہیں ہے اس لیئے امکان عقلی تو کوئی شے وجودی نہیں ہے صرف ایک خیال غیر محقق الوقوع ہے۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ علاوہ اس کے امکان کا اطلاق اُس چیز پر ہوتا ہے جو کبھی ہو اور کبھی نہ ہو لیکن جس چیز کا کبھی وقوع ثابت نہ ہوا ہو تو اس پر امکان کا اطلاق غلط اور محض سفسطہ ہے۔ غرضکہ جو شخص قانون فطرت میں مستثنیات کا مدعی ہو اس کو اُن مستثنیات کے کبھی واقع ہونے کو ثابت کرنا بھی لازم ہے +

حیرت ہے کہ سر سید صاحب جیسے انسان جو قانون ارتقاء پر بن دیکھے ایمان لے آئے تھے۔ قانون فطرت میں استثنیٰ کو نہیں مانتے۔ (اگر ارتقاء کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے قانون فطرت کی استثنائی صورت ہی سمجھا جائے گا کہ اب ارتقاء رک چکا اور تمام قوانینِ فطرت مستحکم ہو چکے)۔ حالانکہ اس کی مثالیں اکثر دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ تمام مائعات جم کر سکڑتی ہیں مگر پانی جم کر پھیل جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم کسی کو لڑکا دیتے ہیں اور کسی کو لڑکی، مگر اکثر درمیانی جنس کا بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عام قانون یہ ہے کہ عورت ایک وقت میں ایک بچے کو جنم دیتی ہے مگر اکثر اوقات کسی کے ہاں چار پانچ یا اس سے زیادہ بچوں کی پیدائش بھی ہو جاتی ہے۔ عام قانون یہ ہے کہ مادہ نر سے حاملہ ہوتی ہے مگر بعض مخلوقات میں نر حاملہ

ہوتے ہیں۔ زہر قانون فطرت کے مطابق انسان کے لیے مہلک ہوتا ہے مگر یہی زہر کبھی کبھی زندگی بھی بخش دیتا ہے۔ (اسکی مثال پرویز صاحب کے ذیل میں آئے گی۔) یہ سب قانونِ فطرت میں استثنیٰ کی مثالوں کے طور پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ ان سب کے لیے قانون نہ ہو۔ یقیناً ان سب کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی قانون ہوگا مگر وہ قانون کبھی کبھی حرکت میں آتا ہے۔ اسی طرح آگ کو ٹھنڈا کرنے کا بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی قانون ہوگا جو حضرت ابراہیمؑ کو بچانے کے لیے حرکت میں آیا۔ مفسر قرآن مولانا ثناء اللہ امرتسری سر سید صاحب کے اعتراض کا جواب یوں دیتے ہیں:

چونکہ اصل وجہ انکار سید صاحب کی اس واقعہ سے یہ ہے کہ یہ واقعہ خرق عادت ہے اس لیے ہم سب باتوں سے پہلے خرق عادت کے امکان یا محال ہونے پر گفتگو کرتے ہیں تاکہ سید صاحب کی بناء فاسد علی الفاسد خوب واضح ہو جائے- خرق یا خلاف عادت پر سپر نیچرل اس کو کہتے ہیں جو قوانین مروجہ کے خلاف جو جیسے پانی کا نیچے کی طرف جانا ایک قانون مروج ہے اگر پانی اوپر کی طرف کو جائے یا باوجود نیچے جگہ ہونے کے ٹھہر جائے تو خلاف عادت کہا جائے گا- یا مثلاً آگ کا کام جلانا ہے اگر بلا مانع ظاہری نہ جلائے تو خرق عادت ہوگا بحث اس میں ہے کہ یہی مروجہ قوانین قدرتی قانون ہیں یا ان کے سوا اور بھی ہیں؟ کچھ شک نہیں کہ خدا کے جتنے کام ہیں سب اپنے اپنے اسباب سے وابستہ ہیں مگر ان سب قوانین پر کوئی فرد بشر مطلع نہیں ہو سکتا مثلاً پیدائش کے متعلق اسکا قانون ہے کہ بکری کا بچہ مثلاً چار ٹانگ اور دو سینگ اور دو آنکھوں والا ہوتا ہے مگر باوجود اس کے لکھنو کے عجائب خانہ میں بکری کے بچے کی شبیہ ایسی ملتی ہے جس کی ایک ہی آنکھ ماتھے پر ہے اور بس تو کیا یہ خلاف قانون ہے؟ اس کے لیے بھی ضرور کوئی قانون ہوگا- مگر ہمیں اس کی اطلاع نہیں- ٹھیک اسی طرح ایسے امور جو حضرت انبیاء علیہم السلام سے بطور معجزہ کے ظاہر ہوتے ہیں ان کے لئے بھی مخفی اسباب ہوتے ہیں- ان اسباب میں سے نبوت یا رسالت کا مجہول الکیف تعلق بھی ایک سبب ہے جس کی کیفیت ہماری سمجھ سے بالا ہے- مگر حقیقت میں تو وہ اپنے ہی اسباب سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان اسباب پر عامہ مخلوق کو اطلاع نہیں ہوئی بلکہ عوام کے نزدیک جو ان افعال کے اسباب ہیں ان کے خلاف یہ امور ہوتے ہیں اس لیے ان کو خرق عادت یا سپر نیچرل کہا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں سپر نیچرل نہیں ہوتے بلکہ عین نیچرل ہوتے ہیں پس ثابت ہوا کہ دنیا کے معمولی قانون مروج کے خلاف بھی ہونا کوئی محال امر نہیں- اسی کا نام معجزہ ہے کہ ایک امر خلاف قانون مروجہ مگر ممکن بالذات کا وقوع بلا اسباب مدعی نبوت سے وقوع پزیر ہو- ایسے امر ممکن بالذات کی اگر کوئی مخبر صادق خبر دے تو اس کے تسلیم کرنے میں چون وچرا کرنا فضول ہے-

سرسید صاحب کا ایک مؤقف یہ بھی ہے کہ قرآن کسی مافوق الفطرت واقعہ کو بیان نہیں کرتا۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ قرآن جن خرقِ عادت چیزوں کو بیان کرتا ہے سید صاحب اسے مروڑ تروڑ کر بمطابق فطرت اور عام واقعہ ثابت کر دیتے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش، جناب مسیحؑ کا مٹی کے پرندوں میں جان ڈال دینا، مردوں کو زندہ کر دینا، اصحاب کہف کا واقعہ، حضرت موسیٰؑ کے معجزات۔ حالانکہ جن لوگوں کی کتابیں پڑھ کر سرسید صاحب معجزہ کے دشمن بن گئے تھے۔ ان کے لیے تو وحی بھی ایک غیر سائنسی چیز ہے۔ وہ تو وحی کا وجود اور قرآن کو الہامی کتاب ہی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ خیر سید صاحب نے تاویل کے ہتھیار کو خوب استعمال کیا مگر کئی جگہ پھنس گئے تو وہاں سے بھی رستہ نکال لیا۔ دیکھیے

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ

یا د تونے اُس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اُسکا حال نہیں جانا جسنے رؤیا میں دیکھا) کہ گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا ہوا تھا اُسنے کہا کیونکر زندہ کریگا (یعنی آباد کریگا اللہ اُسکو اُسکے مرجانے کے (یعنے ویران ہونے کے) بعد پھر اللہ نے اُسکو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اُسکو اُٹھایا خدا نے کہا کتنی دیر تک تو پڑا رہا اُسنے کہا کہ میں پڑا

یہ اس شخص کا قصہ ہے (بعض مفسرین کے مطابق حضرت حزقیلؑ کا) جسے اللہ پاک نے ایک سو سال مردہ رہنے کے بعد زندہ کر دیا تھا۔ اور اس کے کھانے پینے کا سامان تر و تازہ تھا البتہ اس کے گدھے کی صرف ہڈیاں ہی بچی تھیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نظروں کے سامنے گوشت چڑھا دیا۔ اب سرسید صاحب سے کوئی تاویل نہ بن پڑی تو اسے خواب بنا دیا۔

دوسری مثال دیکھیے:

حضرت زکریا جب کہ دعا میں مصروف تھے تو ہاتف غیبی سے آواز دی یعنی حضرت زکریا
نے ایک آواز دینے والے کی آواز سنی کہ وہ بیٹا ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ ایسے امور
کا واقع ہونا فطرت انسانی سے خارج نہیں ہے مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسکے بعد
کی آیتوں میں جو لفظ "قَالَ" ہے۔ اس میں کہنے والا کون ہے۔ خدا یا فرشتہ۔ مگر اسکا

یہاں بھی کوئی تاویل نظر نہ آئی تو فرشتے یا خدا کی آواز سننا فطرت انسانی کے مطابق قرار دیا مگر بتایا نہیں کہ اس طرح کے واقعہ کی نیچری مذہب میں کہاں تک گنجائش ہے اور کیا اب بھی اللہ یا فرشتہ انسانوں کو آوازیں دے دے کر اولاد کی خوشخبری سناتا ہے کہ نہیں کیونکہ یہ تو عین انسانی فطرت ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

حضرت ابراہیم کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال

۵۷

۳۴

دیا گیا تھا مگر انہوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا +

یعنی حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں نہیں ڈالا گیا مگر اللہ پاک یوں ہی آگ کو حکم دے رہے تھے کہ ابراہیمؑ پہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ جہاں سر سید صاحب کی اپنی دال گل رہی ہو گی بے دھڑک توریت، انجیل اور اسرائیلی روایتوں کے

حوالے دیں گے مگر جو چیز اپنے نیچری مذہب کے خلاف ہو گی وہاں مسلمانوں پہ چڑھ دوڑتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے واقعات کو ویسا سمجھا جیسا پچھلی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے یا جیسا یہودی اور عیسائی بیان کرتے ہیں۔ نہایت ادب سے عرض ہے کہ قرآن اگر بائبل کے واقعات کو مکمل طور پہ رد کرنا چاہتا تو انہیں بیان ہی اس طرح کرتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مؤقف کی نفی ہو جاتی مگر قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے انبیاء پر جو الزامات لگائے تھے یا ان کی شان میں جو غلو کیا گیا تھا قرآن نے اس کو تو مسترد کر دیا مگر باقی واقعات کی تصدیق کی۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے اور آگ کے ٹھنڈا ہونے کا واقعہ بھی اسی طرح ہی بیان کیا جیسے اسرائیلی روایات میں تھا تو آپ دو کتب اور عادل راویوں کی شہادت کو کیسے مسترد کر سکتے ہیں اور ایک نیا موقف بنا کسی دلیل کے کیسے پیش کر سکتے ہیں؟ سر سید صاحب خود بھی مانتے ہیں کہ اک مفسر کو تفسیر بیان کرتے وقت گزشتہ واقعات جو کہ اہل کتاب بیان کرتے ہیں، پیش نظر رکھنے چاہئیں:

صرف یہ کام ہے کہ تاریخی گذشتہ واقعات پر خیال کرے اور دیکھے کہ کون سے تاریخی واقعہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے اور کوئی قرینہ اُس واقعہ سے آیت کے متعلق کرنیکا ہے یا نہیں اور اسطرح آیت کا تعلق اُس واقعہ سے قرار دے۔ اِس مقام پر قرآن مجید میں اُن واقعات کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل اور

اب مفسرین کو حضرات ابراہیمؑ پہ آگ کے گلزار ہونے کا واقعہ یہودی روایات میں ویسے ہی مل گیا جیسا قرآن میں (بنا جزیات وتفصیلات) بیان کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے اسی طرح بیان کیا اور احادیث میں بھی یوں ہی وارد ہوا۔ تو پھر اس میں حیل وحجت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اللہ پاک سر سید مرحوم پہ رحم فرمائے۔ نیک انسان تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں انہیں بہت اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ بس نیچریت میں انتہا پسندی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ورنہ حقیقتاً مسلمانوں کا درد اپنے سینے میں رکھتے تھے۔

خواجہ احمد دین امر تسری کا مؤقف:

خواجہ صاحب کو میں جناب غلام احمد پرویز سے بڑا مفکر قرآن مانتا ہوں۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب کا نام اور کام دونوں گمنامی میں کھو گئے۔ سر سید کے بعد شاید خواجہ صاحب ہی نے آتشِ نمرود کے متعلق روایتی مؤقف سے اختلاف کیا تھا۔ خواجہ صاحب یہ تو مانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے مخالفین نے اصلی والی آگ بھڑکائی تھی تا کہ حضرت ابرہیمؑ کو اس میں زندہ جھونکا جا سکے مگر بعد والے واقعہ کے بارے ان کی رائے کچھ یوں ہے:

کو وعظ کے بہانے سے بلاؤ۔ وہاں اسے آگ میں ڈالدو اور راکھ بنا دو۔ اس سے ہمارے برخلاف کوئی ثبوت پیدا نہیں ہوگا۔ انھوں نے شہر سے باہر ایک عمارت بنائی اور بھٹی کو خوب تپایا اور ابراہیم علیہ السلام کو وعظ کے بہانے سے بلا بھیجا۔ جب خدا تعالےٰ پر سچا بھروسہ ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں تڑپائیں گے اور اُن کے جسم کو ریزہ ریزہ کر دینگے۔ حکمت الٰہیہ سے اس بھٹی کی آگ اس مکان کو لگ گئی اور وہ خود ہی نرغے میں آ گئے۔ چھتیں اُن پر گر پڑیں اور وہ خود ہی نیچے دب گئے اور سخت گھاٹے والے بن گئے۔ جب ابراہیم علیہ السلام آئے تو آگ ٹھنڈی اور بیضرر ہو گئی تھی۔ آگ کے مالک نے ہی اُسے حکم دیا تھا کہ تو ابراہیم کے آنے پر ٹھنڈی اور بیضرر ہو جانا تیری گرمی اور تیرا ضرر ابراہیمؑ کو نہ پہنچے جیسا کہ آگے آتا ہے)

ہم خواجہ صاحب کے مؤقف کا احترام کرتے ہیں مگر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ جب مخالفین خود ہی آگ میں جل بھن کر راکھ ہو گئے تو اب خاص طور پر آگ کو ٹھنڈا اور بے ضرر ہونے کا حکم دینے میں کیا حکمت ہے؟ کیا حضرت ابراہیمؑ نے بھڑکتی ہوئی آگ میں کود جانا تھا؟ سادہ سی بات ہے کہ جب کہانی ہی ختم ہو گئی تو اب آگ ٹھنڈی ہو یا نہ ہو اس سے حضرت ابراہیمؑ کی صحت کو کیا فرق پڑنے والا تھا؟ قرآن پاک کی خصوصیت ہے کہ یہ کسی باطل مفہوم کو اپنے اندر گھسنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ اس کی کسی آدھ آیت کو تو اپنے خود ساختہ نظریہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں مگر سارے قرآن کو

اسی نظریہ کے تابع نہیں رکھ سکتے۔ یہی کچھ منکرین معجزہ کے ساتھ ہوا ہے کہ اپنے زمانے کے عقلیت پسندوں کو خوش کرنے کے لیے قرآنی آیات کا مفہوم مروڑ تروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ شاید مطلب براری ہو سکے مگر الٹا بات کو مزید الجھا دیتے ہیں۔ اور خاص بات یہ ہے کہ جن عقلیت پسندوں کے لیے یہ سب مشقت کی جاتی ہے ان کے لیے تو وحی ہی سرے سے ناقابلِ قبول اور ناقابل فہم چیز ہوتی ہے۔ اب جو بندہ جڑ کا ہی منکر ہے۔ آپ شاخیں کاٹ کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ اسی آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

> الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے کہ انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظام عالم کے معمول (Routine) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بندہ خدا، تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑے؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔

(تفہیم القرآن از مولانا مودودی)

آتشِ نمرود اور جناب غلام احمد پرویز:

جناب غلام احمد پرویز صاحب نے سرسید صاحب کے اسی مؤقف کو آگے بڑھایا جب وہ انکار حدیث کا مسلک اختیار کرکے قرآن کا عقلی مفہوم تیار کر رہے تھے، اور اس میں سے اسلامی کمیونزم (یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت) برآمد کر رہے تھے۔ اس سے پہلے جناب پرویز صاحب بھی اسی مؤقف کی حمایت کرتے تھے جو قرآن میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ آگ حضرت ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی۔ پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب نے "تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ" میں پرویز صاحب کی اولین تصانیف میں سے ایک "معارف القرآن" میں سے دو اقتباسات پیش کیے ہیں جن میں پرویز صاحب کا جوش خطابت عروج پر ہے:

مذکورہ صدر مقامات، اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ حضرت ابراہیم کو سچ مچ آگ میں ڈالا گیا تھا، لیکن سورہ انبیاء کی آیاتِ مندرجہ صدر میں، ایک درمیانی کڑی ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کرشمۂ رحمت سے آپ کو آگ کی ہلاکت سے محفوظ رکھا .... یعنی اس قوم نے، ایک بڑے تنور میں آگ کا طوفان جمع کر دیا، جس کے شعلے فناء و ہلاکت کا زندہ پیغام تھے، حضرت ابراہیمؑ نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائی، ہلکے سے نورانی تبسم سے، قوم کی اس شعلہ سامانی اور آگ کی اس ہلاکت آفرینی کو دیکھا، نہایت اطمینان و سکون سے آگے بڑھے، اور

بے خطر کود پڑا، آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی ۲

۱ جوئے نور، صفحہ ۱۲۳ ۲ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۲۷

لیکن کس کا جلنا اور کس کا جلانا، یہ تو ایک آزمائش تھی، جس سے ایمانِ ابراہیمی کندن بن کر نکلا، تنہا عقل کے دائرے میں آج بھی یہ بات سما نہیں سکتی کہ آگ کی تاثیرِ حرارت، کس طرح برودت میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت و جبروت کی حدود، ایک سائنسدان کے معمل (Laboratory) کی چار دیواری میں گھر کر نہیں رہ سکتیں، اس کی وسعتیں، حدود فراموش، اور اس کی پہنائیاں قیود نا آشنا ہیں، جس کے قانونِ مشیئت نے آگ میں حرارت کا اثر پیدا کیا ہے، اس کا ایک ادنیٰ سا اشارہ، اس کا اثر سلب بھی کر سکتا ہے۔ ۲

لیکن آج "مفکر قرآن" کا ذہن، معجزہ کے خلاف پلٹ جانے کے باعث، کل کے موقف سے قطعی متضاد موقف

۱ طلوعِ اسلام، ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۲ ۲ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۲۷

جب پرویز صاحب عقلیت پسندی کی طرف مائل ہوگئے اور معارف القرآن جلد ۳ کو ایڈٹ کر کے "جوئے نور" کے نام سے شائع کیا گیا تو حیرت انگیز طور سے اس میں سے سورہ الانبیاء کی آیت ۶۹ کا ذکر ہی غائب کر دیا گیا۔ شاید پرویز صاحب کے ذہن میں اس وقت تک اس آیت کا کوئی جدید مفہوم جگہ نہیں پا سکا تھا۔ اور سر سید صاحب تو تفسیر کو سورۃ الانبیاء تک پہنچا نہیں سکے تھے جو پرویز صاحب وہاں سے کوئی دلیل پکڑ لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنی اہم اور فیصلہ کن آیت جوئے جور میں جگہ نہ حاصل کر سکی۔

جوئے نور ۱۲۲ حضرت ابراہیمؑ

سکت عینی شہادات کے سامنے لاجواب ہوگئے تو بجائے اس کے کہ اعترافِ حقیقت کر لیتے انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور تجویز کیا کہ آپ کو زندہ آگ میں ڈال دیا جائے کیونکہ ان کے نزدیک بُتوں کی توہین اور مسلکِ بُت پرستی سے بغاوت، جُرمِ عظیم تھا اور ایسے جرائم کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ مجرم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا جائے۔ سورۃ صٰفّٰت میں ہے۔

نمرود کی آگ

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿۳۷/۹۷﴾

لوگوں نے کہا (بس بہت ہو چکی۔ اب) اس کے لئے ایک آتش خانہ بناؤ اور دہکتی ہوئی آگ میں اسے ڈال دو۔

انہوں نے یہ تدبیر کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے خاک میں ملا دیا اور وہ اپنے مشئوم ارادوں میں خاسر و نامراد رہے۔

فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿۳۷/۹۸﴾

چنانچہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک منصوبے کا ارادہ کیا مگر ہم نے انہیں ہی نیچا دکھا کر چھوڑا (کہ ان کی تمام تدبیریں خاک میں ملا دیں)۔

دیکھئے، یہاں پھر فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا کہا ہے، یعنی انہوں نے ابراہیمؑ کے خلاف اس منصوبے کا ارادہ کیا تھا، سچ مچ انہیں آگ کی بھٹی میں نہیں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تدبیروں ہی میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اس مقام سے ہجرت فرما کر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۳۷/۹۹﴾

ابراہیم نے کہا میں اس مقام کو چھوڑ کر وہاں جا رہا ہوں جہاں اس نظامِ ربوبیتِ خداوندی کی تشکیل کے لئے حالات زیادہ سازگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار وہاں میرے لئے بہت جلد کشاد کی راہیں کھول دے گا۔

سورۂ عنکبوت میں ہے:-

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۹/۲۴﴾

پس اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب ہی نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے کہ ابراہیم کو قتل کردو، یا (زندہ) جلا دو۔ اللہ نے اُسے آگ سے بچالیا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہوں (بڑی بڑی) نشانیاں (پنہاں) ہیں۔

اس واقعہ کو سورۃ انبیاء میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۲۱/۶۸)

انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

اس کے بعد ایک آیت چھوڑ کر کہا۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ (۲۱/۷۲-۷۱)

اور دیکھو ہم نے اُسے اور (اُس کے بھتیجے) لوط کو (دشمنوں سے) نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنی سرزمینِ کنعان) اور (پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحٰق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے نیک کردار بنایا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی سلامتی

ان مقامات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سرکش و متمرد قوم نے اپنے جوشِ انتقام میں یہ منصوبہ باندھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے انبار میں ڈال دیا جائے تاکہ ان کے معبود روز روز کی تحقیر و تذلیل سے محفوظ رہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالتے آپ حکمِ خداوندی کے مطابق، وہاں سے چپکے سے ہجرت کر گئے اور یوں وہ قوم اپنے ارادوں میں ناکامیاب رہی۔ جس طرح، جب اہلِ مکہ نے یہ سازش کی کہ نبی اکرمؐ کو رات کی تاریکی اور خاموشی میں قتل کر دیا جائے، تو آپؐ نے بحکمِ خداوندی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور یوں قریش کے خفیہ منصوبے خاک میں مل گئے۔

ہجرت

توریت کے صفحات میں ہم حضرت ابراہیمؑ کو مع ان کے برادر زادہ (حضرت لوطؑ) اور آپ کی حرمِ محترمہ (حضرت سائرہ) کے مصر تک سفر کرتے دیکھتے ہیں جہاں کے بادشاہ نے

بعد میں پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں مذکورہ آیت کا (خود ساختہ) مفہوم کچھ یوں بیان کیا۔

وہ ابراہیمؑ کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ کو یوں بھڑکا رہے تھے' اور ہم ایسا انتظام کر رہے تھے کہ اس آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں اور وہ ابراہیمؑ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔

یعنی جس آگ کو سب آگ سمجھتے رہے وہ کوئی اصلی والی آگ تھوڑی تھی وہ تو انتقام اور دشمنی کی آگ تھی۔ اور اس دشمنی کی آگ کو اللہ پاک "یانار" اے آگ، کہہ کر مخاطب کر رہے تھے کہ ٹھنڈی ہو جا۔ اب یہاں ایک زائد فقرہ یعنی "وہ ابراہیمؑ کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ یوں بھڑکا رہے تھے۔" اضافی داخل کر کے پرویز صاحب ساری امت کے مفسرین (جن میں عقل پرست معتزلہ بھی شامل ہیں) پر برس پڑے کہ انہوں نے زبردستی ایک عام سی بات کو معجزہ بنا کر رکھ دیا۔

اب یہاں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اگر انتقام کی آگ ٹھنڈی اور سلامتی (پرویز صاحب سلامتی کو ہڑپ کر گئے ہیں) والی ہوگئی ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ وہاں سے ہجرت کیوں کر گئے؟ انہیں تو اب چین اور سکون کے ساتھ اپنے آبائی علاقے میں رہنا چاہیئے تھا کہ پرانی دشمنیاں پرانی عداوتیں ختم ہو چکی ہیں اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

پھر پرویز صاحب نے اپنے ایک درس میں اس بارے کھل کر اظہار کیا۔ اور روایتی موقف پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد کیے:

اعتراض: ۱) **قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ حضرات ابراہیم کو سچ مچ آگ میں ڈال دیا گیا۔**

جواب: قرآن میں ذکر نہ ہونے سے یہ کیسے قیاس کر لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں نہیں ڈالا گیا؟ کیا قرآن کا سیاق و سباق کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ کیا اللہ پاک کا براہ راست آگ کو حکم دینا کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا، ظاہر نہیں کرتا کہ حضرت ابراہیمؑ اس آگ کے اندر موجود تھے۔ جس کے کسی دور میں آپ خود بھی قائل رہ چکے

ہیں۔ خود آپ نے ہی تو ایک اصول وضع کیا تھا کہ قرآن ہر چیز بیان نہیں کرتا، کچھ چیزوں، کچھ واقعات کی ہمیں خود ہی کڑیاں ملانی پڑتی ہیں۔ تفسیر مطالب الفرقان میں پرویز صاحب فرماتے ہیں:

لئے کہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے، قرآنِ کریم کسی واقعہ کی تمام کڑیاں بالترتیب خود ہی بیان نہیں کر دیتا۔ ان کے درمیان (GAPS) چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اپنے فہم و بصیرت سے انہیں پُر کر لیں۔ اسے (FILL IN THE BLANKS) کا طریق کہتے ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے بڑا لطیف اندازِ بیان ہوتا ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے پہلے فَتَمَثَّلَ کے لفظ نے اس طرف

اعتراض ۲:) اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر قومِ ابراہیمؑ ایمان کیوں نہیں لائی؟

جواب: اس کا جواب قرآن خود ہی دے دیتا ہے کہ جو لوگ ضد اور ہٹ دھرمی پہ اتر آتے ہیں، ان پر کوئی دلیل کوئی معجزہ کارگر نہیں ہوتا۔ دیکھیے "مفہوم القرآن" میں سورہ انعام آیت ۱۱۰ کے مفہوم میں آپ کیا فرماتے ہیں:

۱۱۰ یہ (مخالفین) خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی محسوس نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے رسول! تم ان سے کہدو کہ اس قسم کی نشانیاں بھیجنے نہ بھیجنے کا معاملہ خدا سے متعلق ہے۔ (میرا کام تو خدا کا پیغام تم تک پہنچانا ہے)۔
(اے جماعتِ مومنین! ان مخالفین کے اس مطالبہ سے تم میں سے بھی بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر انہیں اس قسم کا کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اچھا ہی ہے۔ یہ اس طرح ایمان لے آئیں گے) لیکن تمہیں ان کی دلی کیفیت معلوم نہیں۔ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لانے کے (اس لئے تم ان کی ان باتوں کا خیال نہ کرو۔ بس قرآن کو عقل و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے رہو)۔

اعتراض: ۳) کلدانیوں نے کوئی اصلی والی آگ نہیں بھڑکائی تھی۔ بلکہ یہ تو انتقام کی آگ تھی۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں۔ "نار" عربی کا لفظ ہے۔ یہ آتشِ انتقام، غصے کی آگ، حسد کی آگ کے لیے آتا ہے۔"

جواب: بہت خوب، حالانکہ نار کے لغوی معنی اس قصہ میں بالکل فٹ بیٹھ رہے ہیں مگر آپ اپنے ہوائی گھوڑے دوڑا رہے ہیں کہ یہ اصل آگ کے لیے تھوڑی استعمال ہوتا ہے۔ یہ تو انتقام، غصے یا حسد کی آگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "مفہوم القرآن" میں پرویز صاحب سورہ الانبیاء، سورہ الصافات اور سورۃ العنکبوت کی متعلقہ آیات میں یہ بات ماننے کو تو تیار ہو جاتے ہیں کہ مخالف حضرت ابراہیمؑ کو زندہ جلانا چاہتے ہیں۔ مگر پھر ایک دم وہ آتش جس میں وہ زندہ جلانا چاہتے ہیں۔ وہ آتش اصلی نہیں رہتی بلکہ "آتشِ انتقام" بن جاتی ہے۔ دیکھیے سورۃ العنکبوت میں کیا فرماتے ہیں:

۲۴ (ابراھیمؑ نے اپنی قوم کو یہ سب کچھ نہایت دل نشیں انداز سے سمجھایا لیکن) اس کی قوم کی طرف سے اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ "ابراھیمؑ کو پکڑ لو۔ اسے قتل کر دو۔ اسے زندہ آگ میں جلا دو"۔
(قوت کے نشہ میں بدمست لوگ، دلائل و براہین کا جواب اسی طرح دیا کرتے ہیں!)۔
ان کی طرف سے یہ خالی دھمکی نہیں تھی۔ وہ سچ مچ ایسا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے ابراھیمؑ کو ان کی آتشِ انتقام سے محفوظ رکھا۔ (۲۱/۶۸ : ۳۷/۹۶-۹۷)
اس واقعہ میں بھی ان لوگوں کے لئے سامانِ بصیرت ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔

حالانکہ اوپر آپ دیکھ چکے ہیں کہ خواجہ احمد دین امرتسری اس آگ کو اصلی آگ ہی مانتے ہیں (اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کا اس میں گرنا ان کے نزدیک ثابت نہیں)۔

دوسرا قرآن کا سیاق وسباق خود واضح کر دیتا ہے کہ کہاں حقیقی "نار" یعنی آگ کا ذکر ہے اور کہاں محاورتاً "نار" کا استعمال ہوا ہے۔ اسکی مثالیں دیکھیے:

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿المائدۃ: ۶۴﴾

وہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں خدا اس کو بجھا دیتا ہے اور یہ ملک میں فساد کے لیے دوڑے پھرتے ہیں اور خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿یس:۸۰﴾

جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس (کی ٹہنیوں کو رگڑ کر ان) سے آگ نکالتے ہو۔

یہاں با آسانی پہچانا جاسکتا ہے کہ پہلی آیت میں " آگ " کا استعمال محاورۃً ہوا ہے، جبکہ دوسری آیت میں حقیقی آگ مراد ہے۔ اور پھر زیرِ بحث آیت (الانبیاء:۶۹) میں آگ کو حرفِ نداء کے ساتھ " يَا نَارُ " کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے جو اس کی Physical Existence پر دلالت کرتا ہے۔ خود پرویز صاحب ہی اپنے سورہ انبیاء کے درس میں "نار" کے دو متضاد معنی (نا کہ مفہوم) پیش کرتے ہیں:

نہیں تھی۔ یہ اسی زندگی کے اندر تصادمات تھے اسی دنیا کے اندر یہ ٹکراؤ تھے۔ النار کا یہ لفظ تو ان کے ہاں جنگ کے لیے بولا جاتا تھا۔ آج بھی تو آپ کہتے ہیں کہ وہ توپیں آگ کے گولے برسا رہی تھیں' جنگ کی آگ بھڑک اٹھی' جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ہر زبان میں یہ لفظ ہوتا ہے' اور ان کے ہاں تو یہ لفظ عام تھا۔ ویسے بھی ان کی قوم کے اس زمانے میں Communication یا مواصلات کے ایسے

انہوں نے ارادہ کیا' ارادہ بھی خفیہ کیا اور وہ خفیہ ارادہ یا تدبیر تھی۔ زبان کے اعتبار سے بھی "کیدًا" میں جنگ کا تصور آتا ہے۔ "نار" عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ آتشِ انتقام' غصے کی آگ' حسد کی آگ کے لیے آتا ہے۔ یہ آگ تو روز بھڑکتی ہے خود آپ کی زبانوں (Languages) میں بھی ہے جسے آپ اشتعال دلانا کہتے ہیں' شعلہ تو خود اس کا مادہ ہے۔ یہ شعلے بھڑکانا اور اشتعال دلانا تو آپ روز

خاص بات یہ ہے کہ پرویز صاحب "نار" کے عربی لفظ کا مفہوم واضح کرنے کے لیے محاورے اردو زبان کے استعمال کررہے ہیں۔ حالانکہ ان کو عربی لغات سے اس کی مثالیں پیش کرنی چاہئیے تھیں کہ صرف "نار" بولنے سے عرب لوگ سمجھ جاتے تھے کہ جنگ کی بات ہورہی ہے یا آتشِ انتقام کی بات ہورہی ہے۔

اعتراض: ۴) **تفاسیر میں ناقابلِ فہم اور مبالغہ آرائی پر مبنی باتیں کی گئی ہے۔**

جواب: جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ واقعہ اسرائیلی روایات میں پہلے سے موجود تھا اور قرآن میں بعد میں نازل ہوا تو اس کا پس منظر وغیرہ واضح کرنے کے لیے تفاسیر میں اسرائیلی روایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کام سر سید صاحب نے بھی کیا تھا۔ پرویز صاحب بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکے۔ جہاں انہیں ضرورت پڑی وہاں توریت اور انجیل کے حوالے بھی بے دھڑک دیے ہیں۔ اور جب قرآن خود گذشتہ صحیفوں کا ذکر کرتا ہے ان میں مذکور انبیاء کے واقعات بیان کرتا ہے تو مفسروں نے اگر کسی واقعہ کی تفصیل جاننے کے لیے وہاں سے کوئی روایت بیان کر دی تو کون سا گناہ کر دیا؟ پرویز صاحب نے بھی مفہوم القرآن (صفحہ ۷۰۶) میں ایک یہودی روایت بیان کی ہے تا کہ ان کے مؤقف کی تائید ہو سکے:

> لہ یہودیوں کی طرف سے حال ہی میں تورات کا جو نیا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیرۂ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت سے اُسے (SEA OF REEDS) کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع تھا۔
>
> (Announcement made by Mr. Lisser Zussman,
> Executive Director of the Jewish Publications
> Society of America - Daily Telegraph.
> -- September 1962).

مفسر خود سے گھڑ کر کچھ بیان نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو وہ حجت نہیں ہے۔ (اوپر قارئین پڑھ کر آئے ہیں کہ خواجہ احمد دین صاحب نے بھی ایک عدد کہانی تیار کی تھی وہ بھی آیات کا پس منظر سمجھانے کی ایک کوشش تھی)۔ ان پہ روایات پہ لازماً یقین کرنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل سے روایت کرو مگر نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب (مفہوم)۔ (البتہ ان روایات کی لازمی تکذیب کی گئی ہے جو قرآن اور صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔)

اعتراض: ۵) قرآن تو کہتا ہے ہم نے حضرت لوطؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بچایا(وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا[۲۱:۶۹])۔ اور آپ لوگ کہتے ہیں کہ صرف حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تھا جس سے اللہ نے انہیں بچالیا۔ جبکہ آیت سے پتا چلتا ہے کہ یہ صرف انتقام اور دشمنی کی آگ تھی جس سے اللہ دونوں کو بچا کر لے گیا۔

جواب: غالباً "مفکر قرآن" سورہ عنکبوت کی ان آیات سے ناواقف نہیں ہوں گے۔ جن میں اس واقعہ کی کچھ اور تفصیلات ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ مخالفین نے صرف حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا مگر اللہ پاک نے انہیں اس آگ سے نجات دی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے ان پر اتمام حجت کیا تب حضرت لوطؑ نے بھی ان پر اپنے ایمان کا اظہار کیا اور حضرت ابراہیمؑ ان کے ہمراہ وہاں سے ہجرت کر گئے۔ مندرجہ ذیل آیات پڑھ لینے سے پرویز صاحب کا یہ اعتراض بھی دور ہو جائے گا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۲۵﴾ فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۲۶﴾ (العنکبوت)

تو اُن کی قوم کے لوگ جواب میں بولے تو یہ بولے کہ اُسے مار ڈالو یا جلا دو۔ مگر خدا نے اُن کو آگ سے بچالیا۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اُن کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔ اور ابراہیم نے کہا کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو تو دنیا کی زندگی میں باہم دوستی کے لئے (مگر) پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کر دو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا۔ پس اُن پر لوط ایمان لائے اور (ابراہیم) کہنے لگے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ بیشک وہ غالب حکمت والا ہے۔

اعتراض: ۶) **ان لوگوں نے بس ارادہ ہی کیا تھا(فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا)۔ آگ میں پھینک تھوڑی دیا تھا۔**

جواب: پرویز صاحب کے بھی کیا کہنے جہاں دل کرتا ہے اپنے مفہوم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک ہی لفظ کے خود سے کئی مفہوم گھڑ لیں گے، اور جہاں دل چاہے گا لفظ کے ایک ہی معنی پہ اٹک جائیں گے اور معنی بھی وہ صرف اردو میں رائج ہیں۔ حالانکہ خود پرویز صاحب کا ہی فرمان ہے کہ اردو زبان عربی زبان کے الفاظ کا کماحقہٗ مطلب بیان نہیں کرتے، اور یہاں آپ وہی کررہے ہیں کہ عربی کے "ارادہ" کو اردو کے ارادہ سے ملارہے ہیں ا ور فرمارہے ہیں "اور پھر وہ تو ارادہ ہی ارادہ ہے"۔ صرف سوچ بچار ہے۔ حیرت ہے کہ ایک ایک لفظ کی کھال ادھیڑنے والے پرویز صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے مٹی کے مادھوؤں کو (یہ اعتراض پرویز صاحب نے اپنے درس میں اٹھایا تھا۔) لغت یا قرآن سے حوالے دے کر نہیں سمجھایا کہ "فَأَرَادُوا" کا مطلب کیا ہر صورت میں صرف سوچ بچار کرنا ہی ہوتا ہے یا اس میں ارادے پر عمل کا مفہوم بھی شامل ہے۔ وہ امام راغب سے ہی پوچھ لیتے جن کی طرف وہ ہر لفظ کا معنی "متعین" کرنے کے لیے دوڑتے تھے۔ امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں: والْإِرَادَةُ منقولة من رَادَ يَرُودُ: إذا سعى في طلب شيء "ارادہ، یہ راد یرود سے ہے جس کے معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں۔" یعنی ارادہ میں اس چیز کے لیے کوشش کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿السجدۃ:۲۰﴾

اور جنھوں نے نافرمانی کی اُن کے رہنے کے لئے دوزخ ہے <u>جب چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اس میں لوٹا دیئے جائیں گے</u>۔ اور اُن سے کہا جائے گا کہ جس دوزخ کے عذاب کو تم جھوٹ سمجھتے تھے اس کے مزے چکھو۔

دیکھیے اس آیت میں دوزخیوں کے ارادے کا ذکر ہے کہ وہ دوزخ سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اب اگر ارادے سے اردو زبان والا ارادہ مراد لیا جائے کہ ابھی وہ سوچ بچار ہی کررہے ہیں تو انہیں واپس دوزخ میں لوٹانے کا کیا مطلب؟ یعنی دوزخی ارادے

کے ساتھ عمل بھی کریں گے کہ کسی طرح دوزخ سے باہر نکل جائیں مگر ناکام ہوں گے۔ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿الأنبياء:۷۰﴾ کا حقیقی مطلب یہی ہے کہ انہوں نے جو ارادہ باندھا اور اس کے نتیجے میں جو کوششیں کیں وہ سب غارت گئیں۔ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں سے صاف بچالیا اور کافر منہ دیکھتے رہ گئے۔

پرویز صاحب نے لفظ کید کا جنگی مفہوم بیان کر کے اس قصے کو ایسا سنسنی خیز روپ دے دیا ہے کہ گویا جیسے کوئی جنگ چل رہی ہو۔ فرماتے ہیں:

رہے تھے' اندر کوئی خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔ اب اس تدبیر کے اندر کیا کچھ ہو رہا تھا' قرآن نے اس کی تفصیل نہیں دی۔ اس میں ایک ''کید'' کا لفظ بتا دیا اور وہ بھی ''ارادوا'' ہے کہ اس کے متعلق کچھ ارادے باندھ رہے تھے' وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ ایسا کیا جائے یعنی خفیہ طور پہ سوچ رہے تھے اور اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جسے جنگ کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے والد یا ان کے ہاں کا وہ کنبہ یا ان کے ہاں کے جو ساتھی ہیں اعتقادات کے افتراق کے باوجود جب اگر ایسی صورت پیدا ہو تو جنگ کی صورت پیش آ سکتی ہے لہٰذا وہ ساری چیزیں ان کے سامنے تھیں اور مسئلہ اتنا اہم تھا کہ وہ خفیہ طور پر کچھ اس کے متعلق ارادے کر رہے تھے۔ ان کی اہمیت نظر آ رہی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات تھی ورنہ کسی ایک فرد کے خلاف کچھ کرنا یا اس کو لے کر جلا دینا' کونسا ایسا مشکل مسئلہ تھا جس کے لیے خفیہ سازشیں اور تدبیریں کرنا پڑتیں اور پھر وہ تو ارادہ ہی ارادہ ہے۔

اب دیکھیں کتنے مفروضے پرویز صاحب نے کھڑے کر دیے کہ مذہبی پیشوا ''مار دو، جلا دو'' کے نعرے لگا کر عوام کو مشتعل کر رہے تھے، مگر حقیقت میں ان کی ''اسٹینڈنگ کمیٹی'' کے خفیہ اجلاس چل رہے تھے کہ یہ جنگ کیسے لڑی جائے۔ اور یہ خفیہ سازش اس لیے کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ سے ڈر رہے تھے جو کہ پہلے ہی انہیں عاق کر چکا تھا۔ اور یہ سب لفظ کید کی آڑھ میں کر رہے ہیں۔ حالانکہ کید کا مطلب بس تدبیر کرنا ہے اس کا اچھا ہونا، برا ہونا، خفیہ ہونا، یا جنگی چال ہونا اسکی اضافی صفات ہیں۔ پرویز صاحب اوپر تو آرام سے کہہ کر گزر گئے کہ قرآن میں ذکر نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا تھا مگر جو کچھ پرویز صاحب اختراع کر رہے ہیں اس کا ذکر پتا نہیں کون سے قرآن میں ہے جو مزے سے بیان کر رہے ہیں۔

پرویزی مؤقف کی کمزوریاں:

سورہ انبیاء آیت ۶۹ کے سلسلے میں پرویز صاحب کا طرزِ عمل ایسا رہا ہے کہ جیسے وہ اس آیت اور اس سے ظاہر ہونے والے مفہوم سے نظریں چرا رہے ہیں۔ وہ نہیں بتاتے کہ اللہ کے خود آگ کو کیوں مخاطب کیا؟ "یا نار" کا کیا مطلب و مفہوم ہے؟ آگ کو ٹھنڈا تو ہونے کو کہا گیا مگر ساتھ سلامتی والی ہونے کا بھی حکم دیا گیا اس کا کیا مطلب ہے؟ ان سب باتوں سے بچنے کا پرویز صاحب کو آسان طریقہ یہ نظر آیا کہ مولوی پر برس پڑو کہ وہ سوچنے کا کام تو کرتا ہی نہیں کیونکہ مذہب میں سوچنا حرام ہے۔ یوں بات دوسری طرف نکل جائے گی اپنے مؤقف کی کمزوری چھپ جائے گی۔

پرویز صاحب نے جو مؤقف اپنایا ہے اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر دی تھی تو پھر حضرت ابراہیمؑ وہاں سے ہجرت کیوں کر گئے؟ اور اگر انتقام کی آگ ٹھنڈی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انتقام سے بچا کر حضرت ابراہیمؑ کو ہجرت کرا دی گئی (جیسا کہ جوئے نور میں دعویٰ کیا تھا) تو پھر تو یہ ٹھنڈی ہوتی نہ ہوتی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا؟ اگر آپ اللہ کا تجریدی تصور ہی مانتے ہیں کہ اللہ بس کچھ قوانین علت و معلول کے بنا کر فارغ ہو گیا تو بتایئے کون سی علت تھی جس کے ذریعے انتقام کی آگ ٹھنڈی کی گئی؟ خدا تو دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ اب اس نے دخل کیسے دے دیا؟

پرویز صاحب کو یہ سب سخن سازیاں اس لیے کرنا پڑیں کہ ان کا دماغ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ آگ ٹھنڈی بھی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اگر ان کو قرآن کی آیت کے اصل مفہوم پر شک تھا تو اس مسئلہ کو سائنسی تحقیق کے حوالے کر سکتے تھے جیسے انہوں نے حضرت نوحؑ کے "ناقابل یقین" طول عمر کو تاریخی تحقیقات کے حوالے کیا تھا (مفہوم القرآن صفحہ ۹۱۲)

لہ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی عمر دو سو سال کی تھی (سنۃ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل کے ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ہزار فصلوں کے اڑھائی سو سال ہوئے۔ ان میں سے پچاس سال نکال دیجیے تو باقی دو سو سال رہ گئے۔ یا یہ معنی بھی کہ ان کی عمر اڑھائی سو سال کی تھی جن میں سے پچاس سال (زمانہ قبل از نبوت) آرام کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سختیوں کا زمانہ شروع ہو گیا۔ یہ بہرحال قیاسات ہیں جب تاریخی تحقیقات کسی یقینی نقطہ تک پہنچیں گی تو اس کا حتمی مفہوم سامنے آ جائے گا۔

کچھ جدید اعتراضات کا جائزہ

۱) آگ اگر بجھ جائے تو وہ تو راکھ بن جاتی ہے۔ اور راکھ میں سے کیا چیز سلامتی والی کیسے بن سکتی ہے؟

جواب: اللہ پاک نے آگ کو حکم دیا تھا کہ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی۔ نا کہ بجھنے کا حکم دیا تھا۔ عربی کی جتنی بھی لغات و تفاسیر اٹھا کر دیکھ لیں۔ جب اس آیت کا ذکر آتا ہے تو وہاں آگ کا ٹھنڈا ہونا ہی بیان کیا جاتا ہے بجھنا نہیں۔ آگ کے بجھنے کے لیے عربی میں "طفئت" (مادہ: ط ف ء) کا لفظ مستعمل ہے اور قرآن نے بھی اسی کے مشتقات استعمال کیا ہے:

كُلَّمَآ أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ﴿المائدۃ: ۶۴﴾

وہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

اللہ پاک نے آگ کو ٹھنڈی ہونے کا حکم دیا تھا اور سلامتی اس ٹھنڈک کی صفت (Parameter) ہے یعنی آگ اتنی ٹھنڈی نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نقصان پہنچائے۔ بلکہ بس مناسب حد تک ٹھنڈک ہو جو حضرت ابراہیمؑ کے لیے باعثِ سلامتی ہو۔

۲) اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے۔ کیا اللہ نے اپنے قانون کی خلاف ورزی کی ہے؟ اللہ تو فرماتا ہے کہ تم اللہ کی سنت یعنی (قانون فطرت یا Law of Nature) میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

جواب: یہ سنت اللہ کی من مانی تشریح ہے۔ قرآن نے کسی جگہ قانون فطرت یا لاء آف نیچر اس حیثیت سے بیان نہیں کیے کہ وہ اٹل ہیں قرآن اگر طوفانِ نوح میں لوگوں کے ڈوبنے یا دوزخیوں کے آگ میں جلنے کا ذکر کر رہا ہے تو وہ کوئی سائنسی قوانین نہیں بیان نہیں کر رہا (جیسا کہ سر سید صاحب کو شبہ ہوا تھا) بلکہ ان واقعات کو بطور عبرت بیان کیا ہے۔

مشرکین اور منکرین کو اس کائنات اور اس دنیا کے مشاہدے کی دعوت دی ہے کہ دیکھو جو کچھ ہو رہا ہے کیا یہ خود بخود ہو رہا ہے ؟ یا اس کے پیچھے کسی ہستی کا ارادہ کار فرماں ہیں۔ اس میں اصل میں دو قسم کے لوگوں کو دعوت ہیں ایک تو دہریوں کے لیے کو کہتے ہیں کہ ساری کائنات خود بخود بن گئی۔ اور دوسرا مشرکین کے لیے جو زمین کے لیے الگ کارساز ٹھہراتے ہیں۔ آسمان کے لیے الگ، بارش کے لیے کسی اور دیوتا کو پکارتے ہیں اور دولت (رزق) کے لیے کسی اور کو۔ ان کو سمجھایا جارہا ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک ہی ہے۔ اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔ اور وہ اپنا امر نافذ کرانے پر بھی قادر ہے۔ اسے کسی دیوی دیوتا کی شراکت کی ضرورت نہیں ہے۔

باقی "سنت اللہ" میں اللہ پاک نے اپنا ایک اصول بیان کیا ہے جو کہ سرکش قوموں کے متعلق ہے جیسا کہ کسی دور میں غلام احمد پرویز صاحب کے "طلوع اسلام" کا بھی مؤقف تھا:

بہر کیف مؤلف کے مادیین کے تتبع وتقلید میں بیان کردہ اٹل قوانین فطرت اور ان کے آزاد طبعی و اضطراری عمل کا کتاب وسنت کے اندر کوئی وجود نہیں۔ سنت اللہ کے لفظ سے مؤلف نے جو دھوکہ کھایا ہے یا اوروں کو اس میں گرفتار کرنے کی سعی کی ہے اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ لفظ قرآن مجید کے اندر ایک خاص متعین معنے میں استعمال ہوا ہے "سرکش اقوام کو ان کے باغیانہ اعمال کی پاداش دینا" اس معنی کو کتاب اللہ میں لفظ سنت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مؤلف ترجمان القرآن نے تخصیص محل کو بے دردی سے نظر انداز کر کے دجو

اگر یہ سمجھا جائے کہ سنت اللہ سے مراد لاء آف نیچر ہے اور اللہ قرآن میں جو کچھ بیان کرتا ہے بس وہی قانون قدرت ہے اس سے کم زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فی الحال بس ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:

پرویز صاحب حضرت مریمؑ کے اس قول کو لے کر کہ "مجھے کسی انسان نے نہیں چھوا" اس چیز کو خدا کا قانون قرار دیتے ہیں کہ حمل کے لیے میاں بیوی (یعنی مرد اور عورت) میں جنسی اختلاط لازمی ہے، جب کہ آج سائنسی ترقی کی بدولت مرد

اور عورت کا اختلاط ضروری نہیں رہ گیا۔ بنا جنسی عمل کے ہی اسپرم ٹرانسفر کیے جا رہے ہیں، حتیٰ کہ بچہ کسی اور عورت کا ہے اور پل کسی اور عورت کے پیٹ میں رہا ہے۔ اب حقیقت صرف اتنی ہے کہ حضرت مریمؑ کے دور میں عورت صرف دو طریقہ سے حاملہ ہو سکتی تھی، یا تو شوہر کے ذریعے سے جو قانونی طریقہ تھا اور یا پھر بدکاری کے ذریعے۔ اور حضرت مریمؑ اسی بات کو بیان کر رہی تھیں نا کہ کوئی حیاتیات (Biology) کا اٹل قانون سمجھا رہی تھیں۔ یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔ باقی آگ کے جلانے کے متعلق قانون قدرت میں ایک استثنا تو خود قرآن میں ہی بیان کر دیا گیا ہے یعنی ایک ایسے درخت کا ذکر کیا گیا ہے جو جہنم کی تہہ میں بھڑکتی ہوئی آگ کے بیچ اگتا ہے:

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿الصافات: ۶۴﴾

بے شک یہ ایک درخت ہے جو جہنم کی جڑ (تہہ) میں اگتا ہے۔

۳) اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اس نے ہر چیز کا ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ اور آگ کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ جلائے۔ اور اللہ یہ بھی کہتا ہے کہ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ یعنی قوانینِ فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور مزید خدا یہ بھی فرماتا ہے کہ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ یعنی اللہ کا قانون (قانون فطرت) اللہ بھی نہیں بدلتا۔

جواب: اگر آیات کو ان کے سیاق و سباق ہٹا کر ہی سمجھنا ہے تو دنیا کا کوئی بھی مطلب اس میں سے اخذ کیا جا سکتا ہے آپ ہی کے مکتبہ فکر کے کچھ بدفطرت لوگ آیات کو ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر ان میں سے اپنا مفہوم نکالتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ختمِ نبوت کے بھی منکر ہیں، اور محمدؐ نامی کسی شخص کے وجود کے بھی۔ (نعوذ باللہ)

یہ جو آیات کے اجزاء آپ نے نقل کیے ہیں یہ بھی خاص سیاق و سباق میں وارد ہوئے ہیں آپ پوری آیت اور اس سے اگلی پچھلی آیات پڑھ کر آسانی سے صحیح مفہوم سمجھ سکتے ہیں اگر پہلے سے کوئی مفہوم ذہن میں نہ بٹھایا ہو۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ دنیا میں جاری و ساری قوانینِ فطرت (جن میں سے اکثر اٹل قوانین نہیں بلکہ مشاہدات ہیں) کی بات نہیں کر رہا۔ کیا ابو جہل وغیرہ اس بات کے منکر تھے کہ آگ جلاتی ہے؟ یا یہ سمجھتے تھے کہ پانی میں بھاری چیز ڈوب نہیں سکتی اس لیے اللہ

تعالیٰ نے قرآن میں یہ سائنسی حقائق بیان کر دیے۔ (ہاں آپ لوگوں کی طرح اس بات کے ضرور منکر ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آگ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے)۔

چلیں بالفرض آپ کی بات مان بھی لیں کہ ان آیات سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ قوانین فطرت بدلتے نہیں ہیں* اور کلمۃ اللہ سے مراد اٹل قوانینِ فطرت ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے سارے قوانینِ فطرت جان لیے ہیں؟ کیا آپ نے دنیا کی ہر آگ کا ہر قسم کے حالات میں مشاہدہ کر کے یہ نظریہ اخذ کیا ہے کہ آگ ہر حال میں جلائے گی؟ کیا آپ نے جان لیا کہ اس دنیا میں کوئی ایسا کلمۃ اللہ یا بقول آپ کے کوئی قانون کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جو آگ کی حرارت کو سلب کر سکے؟ آگ کے اندر ہی کوئی ایسا پیمانہ بھی ضرور ہو گا کہ اس کی حرارت سلب ہو سکے۔ پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں زہر کا پیمانہ یہ بتایا تھا کہ یہ مہلک ہوتا ہے۔ اور عام مشاہدہ بھی یہی ہے:

۳۳ (اے رسول!) ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یہ لوگ' اس نظام کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے (جو یہ بات تم پر اس طرح گراں گزرے) یہ قوتانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے $\frac{27}{14}$)۔ اس لئے' ان کی ان باتوں سے دل پر برا اثر لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں' وہ ممدِ حیات ہے' تو اس سے اس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے۔ ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیئے)۔

---

* یہ بیان قرآن کا ہر گز نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ ہندوستانی منکرینِ معجزہ (جن کے سرخیل سرسید ہیں) نے ڈیوڈ ہیوم (وفات ۱۷۷۶) کی کتاب سے چرایا تھا:

A miracle is a violation of the laws of nature; and because firm and unalterable experience has established these laws, the case against a miracle is—just because it is a miracle—as complete as any argument from experience can possibly be imagined to be.

Enquiry Concerning Human Understanding by David Hume

دیکھیے پرویز صاحب سنکھیا (زہر) کو ممدِ حیات یعنی حیات بخش سمجھنے والوں کی جہالت پر افسوس کر رہے ہیں کیونکہ یہ ایک عام قانون ہے کہ زہر ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ اس سے زندگی چلی جاتی ہے مگر دیکھیے کہ زہر کس طرح پرویز صاحب کے لیے ممدِ حیات ثابت ہوا:

عزیزانِ من! شاید آپ کو معلوم ہے' میں سنایا بھی کرتا ہوں' میں نے کچھ اور بھی دیکھا ہے۔ میرے آپریشن کے بعد وہ وقت آ گیا کہ میرا خون بہنا بند نہیں ہو رہا تھا اور ڈاکٹروں سمیت یہ "فتویٰ" لگ گیا کہ اب زندگی کے کچھ ہی سانس باقی رہ سکتے ہیں۔ احباب اور گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ڈاکٹر وہ تھے۔ جنہیں مجھ سے قلبی تعلق تھا۔ وہ اس پریشانی میں پاگل ہوئے جا رہے تھے' ڈاکٹر کے گھر کی بچیوں نے بھی اس وقت مصلے بچھا لیے۔ کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی۔ جب یہ صورتِ حال ہوئی سپیشلسٹ (ماہرین) آئے۔ انہوں نے کہا: ہاں' ایک انجیکشن ہے' سو وہ لگا دیا۔ اس طرح دوبارہ زندگی مل گئی۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ تریاق کیا چیز ہے کہ ایسی حالت میں بھی یہ کچھ دکھایا؟ کہنے لگے: سانپ کے زہر کا انجیکشن تھا۔ جی' یہ ہے اس کی رحمانیت' یہ ہے اس کی ربوبیت۔ ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے کہ سانپ ڈستا ہے تو مرتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے زہر میں اور کیا ہے؟ سچ کہا قرآن کریم نے کہ وہ انہیں کیا

کیا پہلے یہی نہیں سمجھا جاتا تھا کہ انسان سفر کے لیے صرف گدھے گھوڑے خچر اونٹ ہی استعمال کر سکتا ہے۔ بحری جہاز صرف ہوا کے زور پہ چل سکتے ہیں۔ اور انسان ہوا میں نہیں اڑ سکتا کیوں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے پیمانے ہیں۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ سر سید صاحب کا کہنا تھا کہ قرآن سے شہادت ملتی ہے کہ بھاری چیز پانی میں ہر حال میں ڈوب جائے گی۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ آبدوز پانی کی تہہ میں جاتی ہے پھر باہر آ جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دنیا میں سمندر میں اور بھی پیمانے موجود جن کو استعمال کر کے آبدوز ڈوبنے کے بعد ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ڈیوڈ ہیوم کہا تھا کہ سیسہ ہوا (فضا) میں نہیں ٹھہر سکتا مگر آج ہم ہیلی کاپٹر کو ہوا میں ساکت کھڑا دیکھتے ہیں تو وجہ یہی ہے کہ ہیوم اس پیمانے کو نہیں جانتا تھا جس کے تحت سیسے کو ہوا میں یا فضا میں ساکت کیا جا سکتا تھا۔ اشفاق احمد صاحب کی "بابا صاحبا" میں ایک دلچسپ مکالمہ بیان کیا گیا ہے (صفحہ ۳۱۳) جس کا کچھ حصہ پیش کرتا ہوں:

"فرانس کی رائل سائنس اکیڈمی کے چیئرمین نے کہا......" یہ بات کہہ کر پروفیسر انگاریتی رکے اور بولے "فرانس کی رائل سائنس اکیڈمی ہے یا خالی سائنس اکیڈمی؟"

میں نے کہا "سر خالی سائنس اکیڈمی آف فرانس ہی ہوگی۔ رائل کا لفظ ان کے ذیل میں کہیں بھی نہیں آتا۔"

کہنے لگے "سائنس اکیڈمی آف فرانس کے چیئرمین نے کہا کوئی عقل کی بات کرو، اور سائنس دان ہوتے ہوئے فرضی باتیں چھوڑ دو۔ اڑن کھٹولے اور اڑن غالیچے صرف کہانیوں میں مل سکتے ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں نہیں۔ فزکس کا سیدھا سادا اصول ہے کہ ہوا سے بھاری کوئی شے ہوا میں اڑ نہیں سکتی۔ پھر ہوائی جہاز بنانے کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ احمقوں کی جنت سے باہر نکل آؤ اور الف لیلوی باتیں چھوڑ دو۔ ہوائی جہاز کا بننا "لاز آف نیچر" کے خلاف ہے۔ قدرت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنا قانون توڑنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"لیکن اس اصول کو توڑ کر ہوائی جہاز بنا......" میں نے کہا "اور اب تک اڑ رہا ہے اور اب تو اس کی اڑانیں کرۂ ارض کے ارد گرد روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿لقمان:۲۷﴾

اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر اور (سیاہی ہو جائیں) تو خدا کے کلمات ختم نہ ہوں۔ بیشک خدا غالب حکمت والا ہے۔

تو یقین رکھیے کہ اس دنیا میں بھی کوئی ایسا کلمہ (بھی) ایسا پیمانا بھی ہو گا جس کے تحت آگ میں سے حرارت سلب کی جا سکے۔ آگ کا ٹھنڈا ہونا کسی قانون قدرت کی خلاف ورزی نہیں ہو گا۔ یا پھر آپ دعویٰ کر دیں کہ آپ ان تمام کلمات کو جانتے ہیں۔ جن کو لکھنے کے لیے دنیا کے تمام درخت اور تمام سمندر ناکافی ہیں۔

اگر آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ تو دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اگر آگ ٹھنڈی کرنے کا کوئی پیمانہ ہو بھی تو خدا اسے وہاں استعمال نہیں کر سکتا تو ایسا مجبور خدا آپ کو مبارک ہو اگر، خدا آگ کو ٹھنڈا کرنے پر قادر نہیں ہے تو پھر وہ "انتقام کی آگ" کو ٹھنڈا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا کیونکہ یہ بھی دنیا کے معاملات میں مداخلت ہو گی۔ ہم خدا کو اس دنیا سے لاتعلق نہیں مانتے بلکہ اسے قرآنی حکم "فعال لما یرید" کے مطابق فعال اور ذی ارادہ مانتے ہیں کہ وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

کچھ ذیلی مباحث

۱) اللہ تعالیٰ نے آگ ٹھنڈی کیوں کی؟

جواب: اسکی وجہ یہ تھی کہ مشرکین نے حضرت ابراہیمؑ کو اس نیت اور ارادے کے ساتھ آگ میں پھینکا تھا کہ اپنی جھوٹے خداؤں کی مدد کریں۔ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ اس سے پہلے فرما چکے تھے کہ:

قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ﴿الانبیاء: ٦٦﴾

(ابراہیم نے) کہا پھر تم خدا کو چھوڑ کر کیوں ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکیں اور نقصان پہنچا سکیں؟

تو مشرکین حضرت ابراہیمؑ کو جلانے میں کامیاب ہو جاتے تو ایک تو اس چیز کی خوشی مناتے کہ ہم نے اپنے مزعومہ خداؤں کی مدد کی اور دوسرا لوگوں کو کہتے کہ دیکھو اگر ہمارے خدا ہمیں نفع نہیں پہنچاتے تو ابراہیمؑ کے خدا نے اسے کونسا فائدہ پہنچا دیا۔

۲) معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے یا پیغمبر کا؟

جواب: معجزہ سراسر اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ پیغمبر معجزہ کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ یا واسطہ ہوتا ہے۔ آگ کو گلزار حضرت ابراہیمؑ نے نہیں اللہ تعالیٰ نے کیا تھا۔

۳) کیا بے جان چیز سے خطاب کیا جا سکتا ہے؟

جواب: کوئی بھی چیز جاندار یا بے جان ہونا ہماری نسبت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر سے خطاب کرنے پر قادر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ فرماتے ہیں:

> یہ کہنا کہ آگ تو جماد ولایعقل وبے شعور ہے، اس سے خطاب کیونکر ہوا گا۔ عجیب احمقانہ اعتراض ہے۔ آگ کی جمادیت، بے شعوری وغیرہ اگر ہے تو ہماری نسبت سے ہے یا خود خالق کائنات کی نسبت سے بھی؟ (تفسیر ماجدی اردو)

قرآن میں اللہ پاک کے زمین و آسمان سے مخاطب ہونے کا بھی ذکر ہے۔ اور جہنم سے بھی۔

۴) معجزہ دکھا کر ایمان لانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور نہ ماننے پر عذاب دیا جاتا ہے۔ کیا یہ انسان کی آزادئ ارادہ کے خلاف نہیں ہے؟

جواب: معجزہ دکھا کر کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ پیغمبر ہمیشہ وہ تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے جو بذریعہ وحی ان کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ معجزے صرف فرمائش پر دکھائے جاتے تھے یا پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اور معجزہ نہ ماننے پر کبھی عذاب نہیں آیا بلکہ عذاب قوموں کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے آتا تھا۔ قومِ صالحؑ پر عذاب تب آیا جب انہوں نے اونٹنی کو وارننگ کے باوجود قتل کیا۔ فرعون پہ تب آیا جب اس نے بنی اسرائیل پر مظالم ڈھائے اور جب انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں ہجرت کرنا چاہا تو فوج لے کر ان پہ چڑھ دوڑا۔ حضرت شعیبؑ اور حضرت لوطؑ کی قوم پر بھی ان کی بدفطرتی کی وجہ سے عذاب آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرعون حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا انکار کر چکا تھا پھر بھی زندہ رہا۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کے جو منکر تھے ان پر بھی ان معجزات کے

انکار کی وجہ سے عذاب نہیں آیا۔ ہاں البتہ معجزہ ایک حساب سے اتمام حجت بن جاتا ہے کہ منکر کے ایمان لانے کی صلاحیت اب ختم ہو چکی ہے۔

۵) جن آیات کو معجزہ کہا جاتا ہے ان کی کوئی اور تاویل بھی تو کی جاسکتی ہے۔ قرآن کی کس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے نبیوں کو معجزے دیے جاتے تھے؟

جواب: وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَن كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۚ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿٥٩﴾

اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ اِن سے پہلے کے لوگ اُن کو جھٹلا چکے ہیں (چنانچہ دیکھ لو) ثمود کو ہم نے علانیہ اونٹنی لا کر دی اور اُنہوں نے اس پر ظلم کیا ہم نشانیاں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ڈریں۔

یہ آیات واضح کرتی ہے کہ پہلی امتوں کی طرف نشانیاں (یعنی معجزات) بھیجے گئے تھے۔ نبی پاک ﷺ کو بھی معجزات دیے گئے مگر وہ اتمام حجت کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ مشرکینِ مکہ کو مہلت ملتی رہی حتیٰ کہ فتح مکہ پر وہ سب مسلمان ہوگئے۔ اور جن کے نصیب میں قبولِ اسلام نہیں تھا۔ وہ مختلف جنگوں میں تہہ تیغ ہوگئے۔

باقی یہ کہنا کہ جن آیات سے معجزوں کا وجود ثابت کیا جاتا ہے ان کی کوئی دوسری تاویل بھی کی جاسکتی ہے۔ تو عرض ہے کہ بے شک آپ چاہیں تو کوشش کرسکتے ہیں۔ مگر برصغیر میں آج تک جن لوگوں نے اس کی کوشش کی ہے ایک تو وہ ایک دوسرے سے ہی متفق نہیں ہوتے ہر کوئی دوسرے کی تاویل رد کرکے اپنی کہانی گھڑتا ہے۔ اور نتیجہ یہ کہ کتاب اللہ کو ایک کھلونا سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ جس نظریے کے زیر اثر تاویل کی جاتی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر سارے قرآن کا ترجمہ و تشریح کرنا ایک مشکل کام ہوجاتا ہے۔ بہت سارے تضادات کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور بہت سی تاویلات تو انتہائی بھونڈی ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ

سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا۔ سرسید صاحب اس آیت کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ بچپن میں حضرت عیسیٰؑ مٹی کا پرندہ بنا کر دوسرے بچوں کو کہا کرتے تھے کہ اگر میں اس پہ پھونک ماروں گا تو یہ پرندہ بن جائے گا۔ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی بات نقل کی ہے نا کہ وہ مٹی کی مورت سچ مچ پرندہ بن جاتی تھی۔ اب بتایئے یہ تاویل کہاں تک قابلِ قبول ہو گی؟

۶) ہندو سادھو اور بدھ بھکشو بھی بہت سارے کرتب دکھاتے ہیں۔ کیا ان سب پر بھی ایمان لے آئیں؟ ان کرتبوں اور معجزوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ سارے کرتب جو ہم دیکھتے ہیں یہ سب کسبی ہیں۔ ان کی طویل عرصے تک مشق کی جاتی ہے۔ جبکہ معجزہ سراسر وہبی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مرضی سے جس پیغمبر کو معجزہ عطا کرتا تھا۔ پیغمبر کی خواہش اور ارادہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اور اصل اہمیت پیغام کی ہے۔ اللہ کے نبی دنیا والوں کے سامنے خدا کی واحدانیت کا پیغام پیش کیا کرتے تھے۔ اور ان کی فرمائش پر ہی اللہ تعالیٰ نشانی یا معجزہ بھیجا کرتا تھا۔ بہت سے کرتب اور کرشمے دجال بھی دکھائے گا مگر ایک مسلمان اس پر ایمان نہیں لائے گا کیونکہ دجال کا پیغام اور مقصد باطل اور کفر پر مبنی ہو گا۔

۷) معجزات توہم پرستی کو فروغ دیتے ہیں۔ سوچ بچار کی صلاحیت ختم کر دیتے ہیں۔ معجزوں پر یقین کرنے والی قوم سائنسی و معاشی ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

جواب: یہ بھی ایک غلط سوچ ہے۔ دنیا میں سب سے نمایاں سائنسی ایجادات یہودیوں نے کی ہیں جن کی الہامی و مذہبی کتابیں معجزات کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ سرسید احمد خان جس قوم سے متاثر ہو کر معجزات کا انکار کر رہے تھے اور جس کی ملکہ کے ہندوستان پر اقتدار کو سید صاحب ”ہندوستان پر خدا کی رحمت کا سایہ“ قرار دیتے تھے۔ ان کی مذہبی کتابیں بھی معجزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر وہ نہ صرف ساری دنیا میں فتح کے پھریرے لیے پھر رہے تھے بلکہ ان کے مشنری بھی اپنا پیغام ان علاقوں کے چپے چپے تک پہنچا رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں نمودار ہونے والے ”عقلیت پسند“ دو سو سال سے صرف نعرے بازی ہی کر رہے ہیں کوئی سائنسی کارنامہ ان کے کریڈٹ پر نہیں ہے بس قرآن سے

اس سائنس کو بر آمد کرنے کے چکر میں رہتے ہیں جس کو پتا نہیں کل کو سائنس دان خود ہی رد کر دیں (ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی مثال سب کے سامنے ہے۔ کتنے ہی قرآنی مفکروں نے اسے بھی قرآن میں تلاش لیا تھا)۔ یعنی اصل مسئلہ سوچ کا ہے۔ ورنہ معجزات تو ہمیں ممکنات سے ناممکنات کی طرف بڑھنے کا سبق دیتے ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر اس کام کو کرنے کے اسباب موجود ہیں جنہیں ہم آج ناممکن سمجھ رہے ہیں کیونکہ یہ ساری کائنات اللہ پاک نے انسان کے سامنے مسخر کر دی ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔ ؏

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفی سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

مسلمان ابتداء ہی سے سائنسی علوم کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ قرآن و حدیث میں ذکر کردہ معجزات نے ان کی "تحقیقی" سوچ سلب نہیں کر لی تھی۔ جیسا آج کے عقلیت پسند دعویٰ کرتے ہیں۔ امیر معاویہؓ کے پوتے اور یزید بن معاویہ (جسے ہم اہل تشیع کے اتباع میں یزید پلید کہتے ہیں) کے بیٹے خالد بن یزید کے شوقِ تحقیق سے سائنس کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ مسلمانوں کے اسپین میں اقتدار کے خاتمے تک جاری رہا۔ اس دوران معتزلہ اور کچھ دوسرے فلاسفہ کچھ معجزوں کا انکار کچھ اقرار اور کچھ کی عقلی تعبیر و تشریح کرتے رہے۔ مگر مجموعی طور پہ وحی کے سب قائل رہے۔ یہ جو اکثر کہا جاتا ہے کہ سائنسدانوں اور فلسفیوں پہ کفر کے فتوے لگا دیے جاتے تھے تو وہ ان کے فلسفی اور سائنسدان ہونے کی وجہ سے نہیں لگتے تھے بلکہ اس وقت لگائے جاتے تھے جب وہ مختلف مذہبی تعبیرات مثلاً وحی، نبوت، یا وجود باری تعالیٰ کے بارے فلسفیانہ موشگافیاں کرتے تھے۔ جو سائنسدان ان جھمیلوں سے دور رہے ان پر ایسا کوئی فتویٰ نہیں لگا۔ (جیسے آج کل پرویز ہود بھائی صاحب اپنا فریضہ چھوڑ کر مذہبی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆